محمد عارف*

میر امن کا تصورِ جمال: "باغ و بہار" کی روشنی میں

Abstract:

Mir Amman's Concept of Beauty: In Light of *"Bāgh-o-Bahār"*

Artistic personalities, by their creative works, express their concept of beauty, though it is not necessary for it to comply with the philosophical dialects of aesthetics. But even then, their perception of beauty solves many philosophical problems. Mir Amman Dehlavi (1748-1806) famous Urdu prose writer, was neither a philosopher nor an aesthetician but even then, he had a sophisticated sense of beauty which is depicted in his famous book *Bāgh-o-Bahār*. He presented beauty in its different shapes; for him, beauty is subjective, mysterious and transcendental. With great intensity, he has described its psychological effects on the observer. His aesthetical notion, as evident in this book has also many similarities with Kant's (1724-1804) theory of Sublime. This article discusses Mir Amman's concept of beauty extracted from his book *Bāgh-o-Bahār.*

Keywords: Bagh-o-Bahar, Beauty, Mir Amman, Aesthetics, Kant, Sublime.

تخلیقی شخصیات ،فنی تخلیقات کے ذریعہ اپنے تصور جمال کا اظہار کرتے ہیں۔اس تصور جمال کا علم جمالیات کی فلسفیانہ مباحث سے مطابقت رکھنا ضروری نہیں ہوتا۔بلکہ یہ ان کے شعورِ ذات کا مظہر ہوتا ہے۔وہ حسن کو جس زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں اسے الفاظ کے پیکر زرنگار میں بیان کر دیتے ہیں۔گویا تخلیق کار اپنے احساسِ جمال کو اپنی تخلیقات کے ذریعہ مادی

وجود عطا کرتے ہیں۔ ہر فن کار فلسفیانہ اپج نہیں رکھتا اور نہ ہی تخلیقی فن پارے کو اس لیے تخلیق کرتا ہے کہ وہ اس کے ذریعہ اپنا فلسفۂ جمال پیش کرنا چاہتا ہے۔لیکن اس کے باوجود ان کی تخلیقات میں جھانکتا ان کا احساسِ جمال کئی فلسفیانہ جمالیاتی مسائل کی عقدہ کشائی کر دیتا ہے۔ اردو زبان کے عظیم انقلابی شاعر مولانا الطاف حسین حالی(۱۸۳۷ء۔۱۹۱۴ء) فلسفی اور ماہرِ جمالیات تو نہیں تھے مگر ان کا کہا یہ شعر:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں[۱]

جہاں ان کے جمالیاتی شعور کی گہرائی اور گیرائی کا عکاس ہے وہیں یہ علمِ جمالیات کے ایک اہم مسئلہ ''حسنِ جمالیات کے ارتقا'' پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔یہی حال میر امن دہلوی(۱۷۴۸ء۔۱۸۰۶ء) کا ہے۔ میر امن نہ تو فلسفی ہے اور نہ ہی شاعر لیکن اس کے باوجود اس کی کتاب باغ و بہار (۱۸۰۳ء) میں اس کے احساسِ جمال کی جھلک صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔حسن اسے مبہوت کر دیتا ہے، ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔باغ و بہار میں حسن کے کئی روپ اور مظاہر دکھائے گئے ہیں؛ نسائی حسن ،مردانہ حسن اور اس کے علاوہ دلفریب مناظرِ فطرت ۔میر امن کی باغ و بہار حسن کے ہر رنگ سے آراستہ و پیراستہ ہے۔حسن کے یہ تمام رنگ اور مظاہر اپنے اندر ایک مخصوص آہنگ لیے ہوئے ہیں جس سے میر امن کا ایک جامع تصورِ حسن[۲] کشید کیا جاسکتا ہے۔

میر امن نے حسن کے مظاہرِ ثلاثہ میں سے نسائی حسن کا جابجا تذکرہ کیا ہے۔لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میر امن کو شعرا کی مانند نسائی بدن کا جمالیاتی عرفان حاصل نہیں ،یہی وجہ ہے کہ وہ نسائی جسم کے دل آویز نشیب و فراز اور جمالیاتی خطوط و زوایا کی تفصیلات بیان نہیں کرتا۔میر امن کے پاس حسن شناس نگاہ تو ضرور ہے لیکن نزاکتِ خیال اور رنگینی الفاظ نہیں اس لیے اس کے ہاں نسائی حسن کے جمالیاتی تجربہ کی ترسیل کے لیے تشبیہات و استعارات بہت کم استعمال ہوئے ہیں۔عبیدہ بیگم (پ:۱۹۵۶ء) بھی میر امن کے اسلوب بیان کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

میر امن نے نہ تو تشبیہات اور استعارات کے دریا بہائے ہیں اور نہ انوکھی مثالیں تلاش کر کے لائے ہیں[۳]۔

وہ غالب(۱۷۹۷ء۔ ۱۸۶۹ء) کی طرح حسن کے حسیاتی پیکر نہیں تراشتا کہ رازداں رقیب بن بیٹھے۔وہ نسائی حسن کو پراسراریت اور ماورائیت کے پردوں میں چھپا دیتا ہے۔جمالیاتی تجربے کا ابلاغ ویسے ہی بہت مشکل ہوتا ہے لیکن اگر اس میں پر اسراریت اور ماورائیت بھی شامل ہوجائے تو یہ ادراکِ کامل کی راہ میں بھی مزاحم ہو جاتا ہے ایسے میں کامل ابلاغ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔جب نزاکت خیال اور رنگینیِ الفاظ کا سہارا بھی نہ ہو تو پیکر تراشی مفقود ہو جاتی ہے،یوں قاری کے

ذہن میں حسن کا دھندلا سا تاثر تو ضرور پیدا ہوتا ہے لیکن حسیاتی سطح پر نسائی حسن کا کوئی ایسا طاقت ور اور توانا امیج (image) ابھر کر سامنے نہیں آتا جو قاری کے متخیلہ کو اپنی گرفت میں لے لے۔

میر امن کے نزدیک حسن موضوعی (subjective) ہے اور اس کا تعلق مشاہدہ (observation) کے ساتھ ہے، اسی لیے میر امن نے حسن کو اس کی معروضی اقدار (objective values) کے ساتھ بیان کرنے کے بجائے مشاہد (observer) کی داخلی اور انفعالی کیفیات کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ حسن کی موضوعیت کو بیان کرنے کے لیے میر امن نے یوسف زرگر کی معشوقہ کا ذکر کیا ہے۔ یوسف زرگر کی معشوقہ سیاہ بھوتنی جیسی ہے لیکن اس جوان رعنا کو جو اس کا عاشق ہے، بہت حسین معلوم ہوتی ہے اور وہ ایک لمحہ کو اس کی جدائی برداشت نہیں کر پاتا:

> اگر حکم کرو تو اپنی معشوقہ کو بلوا کر اس مجلس میں تسلی اپنے دل کی کروں؛ اس کی جدائی سے جی نہیں لگتا۔ یہ بات ایسے اشتیاق سے کہی کہ بغیر دیکھے بھالے فقیر کا دل بھی مشتاق ہوا[۴]۔

عاشق کی بے قراری اپنی جگہ مسلم لیکن جب وہ معشوقہ رونق افروز محفل ہوتی ہے اور مہمان درویش کی نگاہ اس پر پڑتی ہے تو وہ ڈر سا جاتا ہے اور لاحول پڑھ کر رہ جاتا ہے۔ میر امن نے معشوقہ کی جو ہیئت کذائی بیان کی ہے، اس سے صاف آشکار ہوتا ہے کہ حسن سراسر موضوعی معاملہ ہے اور اس کا تعلق دیکھنے والے (observer) کی آنکھ سے ہے:

> اس جوان نے چلوَن کی طرف اشارت کی۔ وونہیں ایک عورت کالی کلوٹی، بھتنی سی؛ جس کے دیکھنے سے انسان بے اجل مرجاوے، جوان کے پاس آن بیٹھی۔ فقیر اس کے دیکھنے سے ڈر گیا۔ دل میں کہا: یہی بلا محبوبہ ایسے جوان پری زاد کی ہے، جس کی اتنی تعریف اور اشتیاق ظاہر کیا! میں لاحول پڑھ کر چپ ہو رہا[۵]۔

اس سیاہ رو "حسینہ" کے قبیح الصورت ہونے کو ظاہر کرنے کے لیے فرد واحد کی گواہی کافی تھی لیکن میر امن نے اپنے موضوعی نظریہ کو تقویت دینے کے لیے ایک جمِ غفیر کے منھ سے اس کے قبح کو آشکار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو باغ و بہار کی یہ عبارت:

> جب آدھی رات گئی وہ چڑیل خاصے چوڈول پر سوار ہو کر بلائے ناگہانی سی آ پہنچی۔ فقیر نے لاچار خاطر سے مہمان کی استقبال کر کر نہایت تپاک سے برابر اس جوان کے لا بٹھایا۔ جوان اس کو دیکھتے ہی ایسا خوش ہوا جیسے دنیا کی نعمت ملی۔ وہ بھتنی بھی اس جوان پریزاد کے گلے لپٹ گئی۔ سچ مچ یہ تماشا ہوا جیسے چودھویں رات کے چاند کو گہن لگتا ہے۔ جتنے مجلس میں آدمی تھے اپنی اپنی انگلیاں دانتوں دابنے لگے کہ کیا کوئی بلا اس جوان پر مسلط ہوئی۔ سب کی نگاہ اسی طرف تھی تماشا مجلس کا بھول کر، اس کا تماشا دیکھنے لگے۔ ایک شخص کنارے

> سے بولا: یارو! عشق اور عقل میں ضد ہے۔ جو کچھ عقل میں نہ آوے، یہ کافر عشق کر دکھاوے۔ لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھوں سے دیکھو۔ سبھوں نے کہا: آمنا، یہی بات ہے[۶]۔

مذکورہ بالا اقتباس کے آخری سطر قابل غور ہے جس میں میر امن نے صاف لفظوں میں یہ کہہ کر حسن کے موضوعی ہونے کا اثبات کر دیا کہ ''لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھوں سے دیکھو' اور سب اہل مجلس نے اس جملے کی تائید کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن کے بارے میں میر امن موضوعی مکتبِ فکر (subjectivism) سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ جملہ کانٹ (Immanuel Kant۔ ۱۷۲۴ء۔ ۱۸۰۴ء) کے نظریہ Subjective Universality[۷] کے بھی خلاف ہے جس کی رو سے ایک شے اگر کسی ایک شخص کو حسین معلوم ہوتی ہے تو اس میں یہ صفت آفاقی ہوگی اور ہر ایک کو وہ شے حسین دکھائی دے گی۔

مشاہد (observer) کی داخلی اور انفعالی کیفیات میں میر امن نے تحیر کو بہت اہمیت دی۔ تحیر کا معنیٰ ہے کہ جب کسی حسین معروض کی طرف دیکھیں تو اس کے رعبِ حسن کی وجہ سے اس پر نگاہ نہ ٹکے[۸]۔ میر امن اس تحیر کو اس کے انتہائی درجہ پر لے جاتا ہے جہاں یہ کیفیت دہشت سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ اور حسن ایک پراسرار ماورائی حقیقت کے طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ چنانچہ پہلے درویش کی معشوقہ کا ذکر کرتے ہوئے میر امن لکھتا ہے:

> دیکھا تو کاٹھ کا صندوق ہے۔ لالچ سے اسے کھولا۔ ایک معشوقِ خوب صورت، کامنی سی عورت، جس کے دیکھنے سے ہوش جاتا رہے؛ گھائل، لہو میں تر بہ تر، آنکھیں بند کیے پڑی کلبلاتی ہے[۹]۔

مذکورہ بالا اقتباس میں ''خوب صورت کامنی سی عورت'' کے حسن و جمال کی تفصیلات بیان کرنے کے بجائے میر امن نے حسن کی دید سے مشاہد کی نفسیاتی کیفیت بیان کر دی ہے کہ وہ ایسی صاحبِ جمال تھی کہ دیکھنے والوں کے ہوش اڑے جاتے تھے۔ یہ میر امن کے اسلوب (diction) کی عمومی خصوصیت ہے کہ وہ حسن کے لیے ایسے الفاظ وتراکیب استعمال کرتا ہے جس سے حسن کے فوق الفطرت اور ماورائی ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نسائی حسن کو ''پری'' اور مردانہ حسن کے لیے ''پریزاد'' کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔

> میں رات دن خدمت میں اس پری کی حاضر رہتا، آرام اپنے اوپر حرام کیا۔ خدا کی درگاہ سے روز روز اُس کے چنگے ہونے کی دعا مانگتا[۱۰]۔

میر امن نے جہاں کہیں حسن کے لیے ''پری'' کا لفظ استعمال نہیں کیا وہاں اس کا اسلوب سلبی (negative) ہے۔ وہ ممدوح سے انسان ہونے کی نفی کرکے اس کے فوق الفطرت ہونے کا اثبات کرتا ہے، چناں چہ وزیر زادی سوداگر بچے کے بہروپ میں جب نیشاپور پہنچتی ہے تو شہر کے چوک میں واقع جوہری کی دکان میں آہنی پنجروں میں مقید انسان اور جواہر کا پٹا

گلے میں ڈالے سونے کی زنجیر سے بندھا کتا دیکھ کر بہت متعجب اور متحیر ہوتی ہے۔ایسے میں اس کا اپنا حسن دیکھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال رہا ہے۔ملاحظہ ہو میر امن نے اس کے حسن و جمال کی ماورائیت کی منظرکشی سلبی انداز میں کس طرح کی ہے:

> یہ تو اس حیرانی میں تھا اور تمام خلقت چوک اور راستے کی اس کا حسن و جمال دیکھ کر حیران تھی اور ہکا بکا ہو رہی تھی۔سب آدمی آپس میں یہ چرچا کرتے تھے کہ آج تلک اس صورت و شبیہ کا انسان نظر نہیں آیا[۱۱]۔

میر امن حسنِ صورت کے ساتھ ساتھ حسنِ سیرت کا بھی قائل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے درویش (شہزادۂ اصفہان) کی محبوبہ (شہزادیٔ بصریٰ) نہ صرف شکل وصورت کے اعتبار سے صاحبِ حسن و جمال ہے بلکہ اپنی سیرت اور اخلاق و کردار کے حوالے سے بھی عدیم النظیر ہے۔شہزادۂ اصفہان، بصرے کی شہزادی کی سخاوت کا سن کر اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ محبت اسے شہزادی سے ملاقات کے لیے بے تاب کر دیتی ہے اور وہ اس کے شوقِ دیدار کی حسرت لیے بصریٰ پہنچ جاتا ہے۔میر امن کے تخیل نے اس شہزادی کے حسنِ سیرت کو بھی فوق الفطری رنگ دے دیا ہے اور سخاوت کا ایسا انداز دکھایا ہے جس میں حقیقت سے زیادہ افسانوی رنگ محسوس ہوتا ہے۔شہزادہ جب اس شہزادی کی ملاقات کے لیے اپنا ملک چھوڑ کر بصریٰ کی سرحد پر پہنچتا ہے تو وہیں سے اس کی سخاوت کا عجیب وغریب انداز شروع ہو جاتا ہے۔شہزادہ اس کے ملک میں جہاں شب بسر کرتا ہے وہاں:

> نوکر چاکر اسی ملکہ کے، اس کا استقبال کر کر ایک مکانِ معقول میں اتارتے اور جتنا لوازمہ ضیافت کا ہوتا بہ خوبی موجود کرتے اور خدمت میں دست بستہ تمام رات حاضر رہتے۔دوسرے دن دوسری منزل میں یہی صورت پیش آتی۔اس آرام سے مہینوں کی راہ طے کی۔آخر بصرے میں داخل ہوا[۱۲]۔

بصریٰ پہنچنے پر اس کی جو مہمان نوازی کی گئی اس کی کیفیت بھی ملاحظہ ہو:

> دیکھا تو ایک عمارت عالی لوازم شاہانہ سے تیار ہے۔ ایک دالان میں اس نے لے جا کر بٹھایا اور گرم پانی منگوا کر ہاتھ پاؤں دھلوائے اور دسترخوان بچھوا کر مجھ تنِ تنہا کے روبہ رو بکاول نے ایک تُورے کا تُورا چن دیا۔ چار بشقاب: ایک میں یخنی پلاؤ، دوسری میں قورما پلاؤ، تیسری میں متنجن پلاؤ اور چوتھی میں کوکو پلاؤ۔اور ایک قاب زردے کی اور کئی طرح کے قلیے: دو پیازہ، نرگسی، بادام، روغن جوش۔اور روٹیاں کئی قسم کی باقر خانی، تنکی، شیرمال، گاؤدیدہ، گاؤ زبان، نانِ نعمت، پراٹھے، اور کباب: کوفتے کے، تکے کے، مرغ کے، خاگینہ، ملغوبہ، شب دیگ، دم پُخت، حلیم، ہریسا، سموسے ورقی، قبولی، فرنی، شیر برنج، ملائی، حلوا، فالودہ، پن بھتا، نمش،

آبشورہ، ساقِ عروس، لوزیات، مربہ، اچار دان، دہی کی قلفیاں، یے نعمتیں دیکھ کر روح بھر گئی[۱۳]۔

یہ تو دستر خوان کی کیفیت تھی اور ظاہر ہے اس میں بہت کچھ جنوبی ایشیا کے ذوق کام و دہن کی کارفرمائی ہے۔شام کے وقت فانوسوں میں کافوری شمعوں کی روشنیوں سے جو سماں بندھا ہے، اس سے قاری کو ایسا تاثر محسوس ہوتا ہے گویا وہ پریوں کے دیس میں ہے۔رات کو استراحت کے لیے پھولوں کی سیج سے بھی نرم بچھونا جس کے دونوں پٹیوں کی طرف گل دان اور چنگیریں پھولوں کی چنی ہوئی، اورعود سوز اور لخلخے روشن تھے جیدھر کروٹ لیتا دماغ معطر ہو جاتا[۱۴]۔یہ سب اہتمام تین دن رات تک رہا جب شہزادے نے اجازت چاہی تو اس نے جو کچھ اسباب ،روپے سونے وغیرہ اس مہمان خانے میں ہے، وہ سب شہزادے کی نذر کیا۔اس کے بعد ایک خواجہ سرا اس کی مہمان نوازی کرتا ہے ۔وہ اس کو پہلے سے بھی عمدہ مکان میں ٹھہراتا ہے۔تین دن تین راتیں وہ بھی اس کی بہترین خدمت کرتا ہے اور آخری دن وہ سارا اسباب جو اس مکان میں تھا، وہ اس کی ملکیت میں دے دیتا ہے۔یہ سب پراسراریت اور ماورائیت سے بھرا ہواہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کیفیت کی مہمان نوازی کو دیکھ کرشہزادے کی اپنی طبیعت میں حیرانی اور تکدر پیدا ہوتا ہے۔ چناں چہ اس کی کیفیت میر امن نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

میں یہ باتیں سن کر حیران ہوا اور چاہا کہ کسی نہ کسی طرح یہاں سے رخصت ہو کر بھاگوں[۱۵]۔

میر امن کے خیال میں چوں کہ حسن ایک ماورائی حقیقت ہے اسی لیے اس قصہ میں وارد ہونے والے ابتدائی دو نسائی کردار ماورائی حسن کے حامل ہونے کے باوصف انسانی وجود رکھتے ہیں۔لیکن میر امن کے ذہن میں چوں کہ حسن کے فوق الفطرت اور ماورائی ہونے کا نظریہ پختہ تھا، یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد جب اس نے شہزادہ نیمروز کی محبوبہ کا ذکر کیا تو اب وہ حسینہ زمینی وجودنہیں رکھتی بلکہ وہ ایک فوق الفطرت ہستی ہے۔وہ نہ تو آدم زاد ہے اور نہ اس زمین سے اس کا تعلق ہے۔وہ کوہ قاف کی رہنے والی شاہِ جنات کی بیٹی ہے۔

میر امن اس قصّے میں فرنگ کی شہزادی کا بھی ذکر کرتا ہے۔فرنگ کی شہزادی کا حسن بھی پراسراریت لیے ہوئے ہے۔ اس شہزادی کا ایک عاشق اس کا مجسمے بنائے اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور اس کے آگے اپنے آنسو بہاتا رہتا ہے۔میر امن نے اپنے عمومی اسلوب سے ہٹ کر اس مجسمے کے حسن و جمال کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ نہ صرف اس کا حسیاتی پیکر قاری کی نظروں میں گھوم جاتا ہے بلکہ پتھر کے اس مجسمے میں زندگی کی حرارت بھی محسوس ہونے لگتی ہے۔ملاحظہ ہو اس مہ جبیں کے مجسمے کے حسن و جمال کی کیفیت:

دیکھا تو ایک تخت بچھا ہے ،اور اس پر ایک پری زادی عورت، برس چودہ ایک کی، مہتاب کی سی صورت، اور

> زلفیں دونوں طرف چھوٹیں ہوئیں، ہنستا چہرہ، فرنگی لباس پہنے ہوئے عجب ادا سے دیکھتی ہے اور بیٹھی ہے اور وہ بزرگ، اپنا سر اس کے پاؤں پر دھرے بے اختیار رو رہا ہے اور ہوش و حواس کھو رہا ہے[۱۶]۔

شہزادیِ فرنگ کے مجسمے کی اتنی تعریف و توصیف کے بعد جب اصل جیتی جاگتی شہزادی کی بات کرتا ہے تو پھر وہی کیفیت کے جیسے الفاظ ہی نہیں۔ چناں چہ یہاں بھی میر امن اس کے حسن کو مشاہد (observer) کی انفعالی کیفیت کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> اے عزیز! تو باور نہ کرے گا، یہ عالم نظر آیا گویا پر کاٹ کر پریوں کو چھوڑ دیا ہے۔ جس طرف دیکھتا تھا، نگاہ گڑ جاتی تھی، پاؤں زمیں سے اکھڑے جاتے تھے۔ بہ زور اپنے تئیں سنبھالتا ہوا رو بہ رو پہنچا۔ جونہیں بادشاہ زادی پر نظر پڑی، غش کی نوبت ہوئی اور ہاتھ پاؤں میں رعشہ ہو گیا[۱۷]۔

میر امن نے حسن کی ماورائیت اور پراسراریت کو ایک اور زاویے سے بھی بیان کیا ہے۔ وہ قصّے میں ایک ایسا نسائی کردار شامل کرتا ہے جو ہے تو آدم زاد لیکن اس کا حسن اس قدر اچھوتا، عدیم النظیر اور ماورائی ہے کہ اس پر شاہِ جنات عاشق ہو جاتا ہے۔ اور اس کے حصول کے لیے وہ اس حسینہ کے دولھا کا عین شب زفاف میں قتل کر دیتا ہے۔ اس حسینہ کے حسن و جمال کا تذکرہ میر امن کی زبانی سنیے:

> جب لڑکی بالغ ہوئی، تو اس کی خوب صورتی اور نزاکت اور سلیقے کا شور ہوا۔ اور سارے ملک میں مشہور ہوا کہ فلانے گھر میں ایسی لڑکی ہے کہ اس کے حسن کے مقابل حور، پری شرمندہ ہے؛ انسان کا تو کیا مُنہ ہے کہ برابری کرے۔ یہ تعریف اس شہر کے شہزادے نے سنی۔ غائبانہ بغیر دیکھے بھالے عاشق ہو۔ کھانا پینا چھوڑ دیا[۱۸]۔

اس کم سن لڑکی کا حسن و جمال ایسا ہے کہ شاہِ جنات ملک صادق اس کی تصویر لیے بھٹکتا پھرتا ہے کہ کسی طرح اس سے ملن ہو جائے۔ چینی شہزادہ جب اپنے چچا کے خلاف شاہِ جنات ملک صادق کی مدد حاصل کرنے کے لیے اس کے دربار میں پہنچتا ہے تو شاہِ جنات اس شرط پر مدد کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس تصویر والی لڑکی کو اس کے لیے ڈھونڈ کر لائے گا لیکن جب شہزادہ لڑکی کی تصویر دیکھتا ہے تو اس کے اپنے ہوش جاتے رہتے ہیں اور وہ خود اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے[۱۹]۔

میر امن نے نہ صرف حسن کو ایک ماورائی حقیقت کے طور پر پیش کیا ہے بلکہ جہاں بھی حسن کہانی کے منظر پر نمودار ہوتا ہے، وہاں میر امن ایک فوق الفطرت اور ماورائی منظر تشکیل دیتا ہے جس سے حسن کی پراسراریت اور ماورائیت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ چناں چہ پہلی حسینہ جب کہانی کے کینوس پر نمودار ہوتی ہے تو اس کے نمودار ہونے کا منظر نہایت پراسرار اور ''طلسماتی'' ہے۔ ایک لکڑی کا صندوق ہے جو قلعہ کی دیوار سے نیچے چلا آتا ہے جسے دیکھ کر پہلا درویش بہت متحیر ہوتا ہے۔ وہ

اس صندوق کو ''طلسم'' سمجھتا ہے جس میں ممکنہ طور پر خزانہ ہوسکتا ہے لیکن جب وہ اس صندوق کو کھولتا ہے تو اس میں سے خزانے کے بجائے حسین وجمیل لڑکی برآمد ہوتی ہے[۲۰]۔

شہزادہ نیم روز کو ہی دیکھ لیجیے وہ شاہ جنات کی دختر خوب اختر کے حسن پر فدا ہے۔شاہِ جنات کی بیٹی پہلی بار جب اس کے روبرو آتی ہے تو یہ منظر بھی پراسراریت سے مملو ہے، ملاحظہ ہو:

> ایک روز اس گنبذ کے نیچے روشن دان سے ایک پھول اچنبھے کا نظر پڑا، کہ دیکھتے دیکھتے بڑا ہوتا جاتا تھا۔ میں نے چاہا کہ ہاتھ سے پکڑ لوں۔ جوں جوں میں ہاتھ لمبا کرتا تھا، وہ اونچا ہوتا جاتا تھا۔ میں حیران ہو کر اسے تک رہا تھا۔ وونہیں ایک آواز قہقہے کی میرے کان میں آئی۔ میں نے اس کے دیکھنے کو گردن اٹھائی۔ دیکھا تو نمدا چیر کر ایک مکھڑا چاند کا سا نکل رہا ہے۔ دیکھتے ہی اس کے میرے عقل و ہوش بہ جا نہ رہے۔ پھر اپنے تئیں سنبھال کر دیکھا تو ایک مرصّع کا تخت پری زادوں کا کاندھے پر معلق کھڑا ہے اور ایک تخت نشین، تاج جواہر کا سر پر اور خلعت جھلا بور بدن میں پہنے، ہاتھ میں یاقوت کا پیالہ لیے اور شراب پیے ہوئے بیٹھی ہے، وہ تخت بلندی سے آہستہ آہستہ نیچے اتر کر اس برج میں آیا۔ تب پری نے مجھے بلایا، اور اپنے نزدیک بٹھایا[۲۱]۔

شاہِ جنات ملک صادق جس آدم زاد حسینہ پر عاشق ہے جب وہ کہانی کے منظر پر نمودار ہوتی ہے تو یہ اس کی شبِ زفاف ہے اور اسی رات شاہِ جنات غیرت کے نام پر اس کے دولھا کا قتل کر دیتا ہے۔ یہ منظر بھی نہایت سنسنی خیز ہے۔الغرض حسن جہاں بھی نمودار ہوا ہے، پراسراریت اور چونکا دینے والے انداز میں ہوا ہے۔

میر امن کے تصورِ حسن میں پراسراریت کی وجہ سے کہیں بھی وہ دھیما پن محسوس نہیں ہوتا جس سے راحت اور تسکین کا احساس جنم لیتا ہے۔میر امن کے تخلیق کردہ وہ تمام کردار جو حسن کے نمائندے اور استعارے ہیں، رعب اور دبدبہ کے حامل ہیں اور ہمیں جرمن فلسفی کانٹ کے تصور جلال (sublime)[۲۲] کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔کانٹ کے تصور جلال کا مطالعہ کرنے کے بعد اگر میر امن کی باغ و بہار کا مطالعہ کیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میر امن نے اپنے کرداروں کے ذریعہ کانٹ کے تصور جلال کی خارجی صورت گری کر دی ہے۔چناں چہ کانٹ نے جمیل وجلیل کا فرق[۲۲] بیان کرتے ہوئے جو سب سے نمایاں نکتہ بیان کیا ہے وہ یہی ہے کہ جمیل اشیا کے دیکھنے سے ہمیں تسکین اور راحت کا احساس ہوتا ہے جب کہ جلیل اشیا کی دید سے مشاہد کے باطن میں ایک قسم کا ہیجان پیدا ہوتا ہے۔کانٹ کا یہ ہیجان ہمیں میر امن کے مختلف کرداروں کے حسن و جمال کی دید سے مشاہد پر ہونے والے نفسیاتی اثرات کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔یہی وہ ہیجان ہے جو انسان کے دل و دماغ میں پوشیدہ اخلاقی قوت کو بیدار کر دیتا ہے اور اس میں ہر خارجی قوت سے ٹکر لینے کی ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔باغ و

بہار کے مردانہ کردار اسی ہیجان کے ہاتھوں مجبور ہو کر حسن کے قرب کی خواہش کرتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے اپنی جان کی پروا کیے بغیر ہر مخالف خارجی قوت سے ٹکر لینے کے لیے نکل پڑتے ہیں اور ہر طرح کے مصائب اور مشکلات سے گزر جاتے ہیں۔ ہر درویش کسی حسینہ کا عاشق ہے اور اس کے قرب اور حصول کے لیے نقدِ جاں لٹانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ وہ ملک فارس کا شہزادہ ہو یا شہزادہ نیم روز، یا چین کا شہزادہ ہر ایک حسن کے عشق میں گرفتار ہے اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہے۔

حسن چوں کہ ماورائی حقیقت ہے اس لیے اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ میر امن حسن کے لیے کوئی مترادف حسی وجود نکال پایا ہے تو وہ ماہ رو، چاند سا مکھڑا، خورشید چہرہ اور گلاب کا سا بدن ہے۔ چاند اور سورج تو ظاہر ہے زمین سے ماورائی حقیقتیں ہیں اور میر امن کا تصورِ حسن اسے زمین سے دور آسمان کی رفعتوں پر لیے جاتا ہے۔ ''گلاب کا سا بدن'' البتہ اس لیے کہا کہ اس کا تعلق حسِ لامسہ سے ہے اور ظاہر ہے ''لمس'' ایسی حس ہے جو ماورائی نہیں ہو سکتی۔ اس کا اظہار کسی ایسی شے کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے جس کو چھوا جا سکے اور ظاہر ہے وہ شے زمینی ہی ہو گی۔ گویا گلاب سے تشبیہ دینے کی بنیادی وجہ اس کا ممکن اللمس ہونا ہے:

اس محنت سے وہ گلاب سا بدن سارا پسینے پسینے ہو رہا ہے[۲۴]۔

میر امن کے خیال میں چوں کہ حسن موصوف کی ایسی صفت ہے کہ جو بھی دیکھے وہ اس پر فدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی لیے میر امن ''حسین'' کے لیے معشوق اور معشوقہ کا لفظ مترادف کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اس کے خیال میں عشق حسن کو مستلزم ہے۔ اور عشق ہوتا ہی حسن سے ہے۔

میر امن نے حسن کے زیر اثر حسین میں پیدا ہو جانے والے احساس برتری اور اوصاف دلبری کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ میر امن کا خیال ہے حسن اپنے معروض میں غرور، رعب، دبدبہ، طنطنہ، بانکپن، ناز و ادا اور نخرہ پیدا کرتا ہے۔ یہ تمام اوصافِ دلبری میر امن نے کرداروں کے مکالمات کے لہجے اور جسمانی حرکات وسکنات میں اس طرح سموئے ہیں کہ نزاکتِ خیال اور رنگینی مقال کی جو کمی رہ گئی تھی، وہ میر امن کے مکالمات نے پوری کر دی۔ چنانچہ ایک دوشیزہ کا اسلوبِ گفتگو ملاحظہ ہو:

یہ سن کر تیکھی ہو، تیوری چڑھا کر خفگی سے بولی: چہ خوش! آپ ہمارے عاشق ہیں! مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔ اے بے وقوف! اپنے حوصلے سے زیادہ باتیں بنانیں خیال خام ہے۔ چھوٹا مُنہ بڑی بات! بس چپ رہ، یہ نکمی بات چیت مت کر، اگر کسی اور نے یہ حرکتِ بے معنیٰ کی ہوتی؛ پروردگار کی سوں، اس کی بوٹیاں کٹوا چیلوں کو بانٹتی۔ پر کیا کروں، تیری خدمت یاد آتی ہے[۲۵]۔

ایک اور مقام پر اسی دوشیزہ کا اندازِ تکلم ملاحظہ ہو جو اس کے رعب و دبدبہ کا بھرپور عکاس ہے:

اُس پری نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا: کیا خوب! ابھی سے بھول گئے! یاد کرو بارہا ہم نے کہا ہے کہ ہمارے کام میں ہرگز دخل نہ کیجیو، اور کسی بات کے معترض نہ ہوجیو؛ خلافِ معمول یہ بے ادبی کرنی کیا لازم ہے؟ فقیر نے ہنس کر کہا: جیسی اور بے ادبیاں معاف کرنے کا حکم ہے، ایک یہ بھی سہی۔ وہ پری نظریں بدل کرتی ہے میں آ کر آگ بگولا بن گئی اور بولی: اب تو، بہت سر چڑھا؛ جا اپنا کام کر، ان باتوں سے تجھے کیا فائدہ ہوگا؟[۲۶]

میر امن نے باغ و بہار میں جو تصورِ حسن دیا ہے اس میں بے اعتنائی اور بے نیازی، حسن کی ایک ادائے محبوبی ہے۔ یہ بے نیازی میر امن کے تخلیق کردہ حسن کے تمام استعاروں میں پائی جاتی ہے وہ خواہ نسائی کردار ہوں یا مردانہ! حسن کی یہ بے اعتنائی پہلی جھلک سے شروع ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو پہلے درویش سے زخمی حسینہ کی بے اعتنائی کی کیفیت:

اسی بے ہوشی کے عالم میں دوپٹے کا آنچل منہ پر لیا، میری طرف دھیان نہ کیا[۲۷]۔

یہ بے اعتنائی اور بے نیازی نا آشنائی اور عدم شناسی کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ اس کا وصف دلبری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب شناسائی ہو جاتی ہے تب بھی یہ بے اعتنائی اور بے نیازی کم نہیں ہوتی بلکہ غرور اور تمکنت کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔

پھر اسی خفگی کے عالم میں اٹھ کر اپنے دولت خانے کو چلی۔ میں نے بہتیرا سر پٹکا، متوجہ نہ ہوئی۔ لاچار میں بھی اس مکان سے اداس اور ناامید ہو کر نکلا[۲۸]۔

سید وقار عظیم (۱۹۱۰ء-۱۹۷۶ء) کے خیال میں بے نیازی کی یہ شان جو محض بے نیازی کی حد سے گزر کر تکبر، تمکنت اور شدید احساس برتری کی صورت میں ظاہر ہوتی رہتی ہے، ہیروئن کی شخصیت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ بے نیازی ہے اور اس کی غمازی نہ صرف منھ سے نکلی ہوئی باتوں سے ہوتی ہے بلکہ چشم و ابرو کی ہر جنبش بھی اس کی شاہد عادل ہے [۲۹]۔ حسن کی اس بے اعتنائی کو عاشق زار خود بھی محسوس کرتا ہے ملاحظہ ہو:

یہ سن کر ایک خدمت گار میرے پاس چھوڑ کر مسجد میں گیا۔ نماز اور خطبے سے فراغت کر کر جب باہر نکلا؛ فقیر کو ایک میانے میں ڈال کر، اپنے ساتھ خدمت میں اس پری بے پروا کی لے جا کر چق کے باہر بٹھایا[۳۰]۔

حسن کی یہ بے اعتنائی اور بے پروائی شعورِ حسن اور غرورِ حسن کا نتیجہ ہے۔

وہ اپنے حسن کے غرور اور سرداری کے دماغ میں، جو میری طرف کبھو دیکھتی تو فرماتی: خبردار اگر تجھے ہماری خاطر منظور ہے تو ہرگز ہماری بات میں دم نہ ماریو۔ جو ہم کہیں، سو بلا عذر کیے جائیو۔ اپنا کسی بات میں دخل نہ کریو۔ نہیں تو پچھتاوے گا[۳۱]۔

یہ غرورِ حسن ، حسینوں کا معلّم ہے جو انھیں نازواداِ،عشوہ وغمزہ اورنخرہ سکھاتا ہے جو حسن کی آن بان ہیں۔ یوسف زرگر جب سیاہ فام لونڈی کے عشق میں گرفتار ہوکر شہزادی سے اعراض کرنے لگتا ہے تو شہزادی اس کے اعراض کو نازنخرہ پر محمول کرتی ہے جو معشوقوں کا وطیرہ ہے :

اس کے نہ آنے کو معشوقوں کا چوچلا اور ناز سمجھا[۳۲]۔

جب شہزادی بہ اصرار بلاتی اور پیغام بھیجتی ہے کہ وہ نہیں آیا تو وہ خود آئے گی تو اس اشتیاق کو دیکھ کر وہ نازونخرہ دکھاتے ہوئے ملنے کو چلا آتا ہے:

جب یہ سندیسا گیا اور اشتیاق میرا نپٹ دیکھا ؛ بھونڈی سی صورت بنائے ہوئے نازنخرے سے آیا[۳۳]۔

لیکن نازوادا کا مطلب یہ نہیں کہ میر امن کے نزدیک سادگی میں حسن نہیں۔سادگی میر امن کے نزدیک بذات خود حسن کی صفت ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اسی جگہ آگے لکھتا ہے:

وہ نازنین ایک مکان میں گلے میں کرتی ، پاؤں میں تہ پوشی ، سر پر سفید رومالی اوڑھے ہوئے سادی خوزادی بن گہنے پاتے بنی ہوئی۔نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی۔کہ جیسے خوش نما لگتا ہے دیکھو چاند بن گہنے[۳۴]۔

حسن بے خود کر دیتا ہے اور مشاہد کی طبیعت غیر ہونے لگتی ہے:

کیا دیکھتا ہوں کہ دو رویہ صف باندھے دست بستہ سہیلیاں اور خواصیں اور اروابیگنیاں، قلماقنیاں، ترکنیاں، حبشنیاں، ازبکنیاں، کشمیرنیاں جواہر میں جڑی عہدے لیے کھڑی ہیں۔ اندر کا اکھاڑا کہوں یا پریوں کا اتارا؟ بے اختیار ایک آہ بے خودی سے زبان تک آئی اور کلیجہ ٹہلکنے لگا پر زور اپنے تئیں تھانبا ان کو دیکھتا بھالتا اور سیر کرتا ہوا آگے چلا۔لیکن پانوں سوسومن کے ہوگئے جس کو دیکھوں پھر یہ نہ جی چاہے کہ آگے جاؤں[۳۵]۔

حسن سے مشاہد پر طاری ہونے والی کیفیت کو ایک اور جگہ یوں بیان کیا ہے:

جس وقت اس کی نگاہیں میری نظروں سے لڑیں مجھے غش آنے لگا۔اور جی سنسنانے لگا۔بزور اپنے تئیں تھانبا۔جرأت کر کے پوچھا: سچ کہو تم کون ہو اور یہ کیا ماجرا ہے؟[۳۶]

حسن کی دید سے سرخوشی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔اس کیفیت کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا:

جب سورج نکلا اس مکان کے بالا خانے کی ایک کھڑکی سے وہ ماہ رو میری طرف دیکھنے لگی۔ اس وقت عالم خوشی کا جو مجھ پر گزرا، دل ہی جانتا ہے شکر خدا کا کیا[۳۷]۔

حسن سے دوری عاشق کو دیوانہ بنا دیتی ہے وہ دیواروں سے سر پٹکتا پھرتا ہے ویرانوں اور بیابانوں میں آوارہ گردی کرتا ہے، یوں جینا دشوار ہو جاتا ہے اور موت آسان نظر آنے لگتی ہے۔ پہلے درویش کی محبوبہ شہزادی جب دریا کنارے کھو جاتی ہے تو اسے نہ پا کر درویش کی جو حالت ہوتی ہے، اس کی کیفیت ملاحظہ ہو:

> دل میں یہی خیال آیا کہ شاید کوئی جن اُس پری کو اٹھا کر لے گیا اور مجھے یہ داغ دے گیا۔ یا اس کے ملک سے کوئی اس کے پیچھے لگا چلا آتا تھا؛ اس وقت اکیلا پا کر منا منو کر پھر شام کی طرف لے ابھرا۔ ایسے خیالوں میں گھبرا کر کپڑے وپڑے پھینک پھانک دیے؛ ننگا منگا فقیر بن کر، شام کے ملک میں صبح سے شام تک ڈھونڈتا پھرتا اور رات کو کہیں پڑ رہتا۔ سارا جہان روند مارا پر اپنی شاہزادی کا نام ونشان کسی سے نہ سنا، نہ سبب غائب ہونے کا معلوم ہوا؛ تب دل میں یہ آیا کہ جب اس جان کا تو نے کچھ پتا نہ پایا، تو اب جینا بھی حیف ہے۔ کسی جنگل میں ایک پہاڑ نظر آیا تب اس پر چڑھ گیا اور ارادہ کیا کہ اپنے تئیں گرادوں[۳۸]۔

میر امن حسن کو جنس سے آلودہ نہیں کرتا اور جہاں اس نے عورت کو جنس کے استعارہ کے طور پر استعمال کیا ہے وہاں اس نے عورت کو بدصورتی کی شکل میں پیش کیا ہے۔ جس کو پڑھ کر قاری میں سفلی اور شہوانی جذبات پیدا نہیں ہوتے بلکہ کراہت محسوس ہونے لگتی ہے۔

میر امن کے تخلیق کردہ مردانہ کردار نسائی کرداروں کے مقابل دبے دبے محسوس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں میر امن نے مردانہ حسن کا ذکر کیا ہے وہاں مردانہ وجاہت سے زیادہ نسائیت کی جھلک اور آمیزش صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔ یوسف زرگر کا حسن اس کی مزاحیہ باتوں نقلیں اتارنے اور چہرے مہرے کے رنگ روپ تک محدود ہے جن میں سے کوئی ایک وصف بھی مردانہ وجاہت کا حامل نہیں، اس پر طرہ یہ کہ وہ عورتوں کی مانند سسکیاں بھی بھرتا ہے۔ ملاحظہ ہو یوسف زرگر کے حسن کی تصویر کشی:

> اس لڑکے سے ٹھٹھا مزاح کر کر دل بہلاتی تھی۔ وہ بھی جب ڈھیٹھ ہوا، تب اچھی اچھی، میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا۔ اور اچنبھے کی نقلیں لانے بلکہ آہ اوہی بھی بھرنے اور سسکیاں لینے۔ صورت تو اس کی طرح دار، لائق دیکھنے کے تھی۔ بے اختیار جی چاہنے لگا[۳۹]۔

میر امن حسن فطرت کا بھی قائل ہے اسی لیے موقع بہ موقع نہایت تفصیل سے حسن فطرت کو بیان کرتا ہے۔ مناظرِ فطرت کی منظرکشی میر امن اس انداز میں کرتا ہے کہ قاری کی نظروں میں جنت کا سا سماں گھوم جاتا ہے اور وہ خود کو اس دل فریب منظر کا حصہ سمجھنے لگتا ہے:

وہ بڑی بہار کا باغ تھا، حوض اور نہروں میں فوارے چھوٹتے تھے، میوے طرح بہ طرح کے پھل رہے تھے۔ ہر ایک درخت مارے بوجھ کے جھوم رہا تھا۔رنگ برنگ کے جانور ان پر بیٹھے چہچہے کر رہے تھے۔ اور ہر مکان عالی شان میں فرش ستھرا بچھا تھا[۴۰]۔

مناظرِ فطرت کے حسن کو بیان کرتے ہوئے میر امن تشبیہات و استعارات کے ڈھیر لگا دیتا ہے ،ملاحظہ ہو مناظر فطرت کا ذکر کس حسنِ بیان سے کیا ہے کہ تصویر نظروں میں پھر جاتی ہے:

دیکھا تو ٹھیک اس باغ کی بہار بہشت کی برابری کر رہی ہے۔ قطرے مینہ کے درختوں کے سرسبز پتوں پر جو پڑے ہیں، گویا زمرد کی پٹریوں پر موتی جڑے ہیں۔اور سرخی پھولوں کی اس ابر میں ایسی بھلی لگتی ہے جیسے شام کو شفق پھولیے ہے اور نہریں لبالب، مانند فرش آئینے کے نظر آتی ہیں اور موجیں لہراتی ہیں[۴۱]۔

میر امن کے خیال میں تمام حسین اشیا میں باہمی تعلق ہوتا ہے،ایک کو دیکھ کر دوسرے کی یاد ضرور آتی ہے۔ چناں چہ پہلے درویش کو فرقت و جدائی کی گھڑیوں میں ہر حسین شے اس کی محبوبہ کی یاد دلاتی ہے اور اس کی فرقت کے زخم تازہ کر دیتی ہے۔چناں چہ پہلے درویش کی ہجر و فراق میں گزری گھڑیوں کی کیفیت ملاحظہ ہو:

میں اس باغ کے پھولوں کی بہار اور چاندنی کا عالم اور حوض ،نہروں میں فوارے ، ساون بھادوں کے اچھلنے کا تماشا دیکھ رہا تھا؛ لیکن جب پھولوں کو دیکھتا تب اس گل بدن کا خیال آتا۔ جب چاند پر نظر پڑتی ،تب اس مہ رو کا مکھڑا یاد کرتا[۴۲]۔

الغرض میر امن نے اس قصہ میں حسن کے جتنے رنگ اور جلووں کا ذکر کیا ہے وہ اپنی شخصیت میں منفرد ، فوق الفطری اور ماورائی حیثیت کے حامل ہیں۔ اول حسینہ جسمانی حسن و جمال کی حامل ہے اور سلیقہ شعاری میں بے مثل ہے۔جب کہ دوسری حسینہ عدیم النظیر حسن سیرت کی مالک ہے۔ تیسری حسینہ جنوں کے بادشاہ کی بیٹی ہے۔ جب کہ چوتھی حسینہ ایسے اچھوتے حسن کی مالک ہے جس پر جنوں کا بادشاہ عاشق ہے۔فرنگ کی شہزادی دیوی دیوتاؤں کا سا حسن رکھتی ہے کہ اس کا ایک عاشق نامراد اس کا مجسمہ بنائے اس کے آگے عقیدت و محبت کے آنسو بہا رہا ہے۔الغرض ہر نسائی کردار اپنے حسن و جمال میں انفرادیت اور پراسراریت کی حامل ہے۔ یہ ماورائیت اور پراسراریت صرف زندہ کرداروں تک محدود نہیں بلکہ مناظر فطرت کو بھی میر امن نے اسی پراسراریت اور ماورائیت میں ملفوف کر کے پیش کیا ہے۔یوں میر امن کا تصورحسن کانٹ کے تصور جلال سے ہم آہنگ ہے اگرچہ میر امن نے جلال کا لفظ استعمال نہیں کیا۔

حواشی و حوالہ جات

* (پ:۱۹۸۰ء) لیکچرر، شعبۂ علوم اسلامیہ، فیڈرل گورنمنٹ کالج سیالکوٹ کینٹ۔

۱۔ الطاف حسین حالی، دیوان حالی (الہ آباد: مطبع انوار احمدی، س ن)، ۱۱۰۔

۲۔ گیان چند نے باغ و بہار کے پلاٹ کے بارے میں یہ شکوہ کیا ہے کہ اس میں وحدت نہیں، پانچ قصے ہیں جنھیں ابتدا اور اور انتہا میں ملا دیا گیا ہے[گیان چند، اردو کی نثری داستانیں (لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۷ء)، ۲۷۸۔] گیان چند(۱۹۲۳ء۔ ۲۰۰۷ء) کا یہ شکوہ پلاٹ کی حد تک درست ہوسکتا ہے اگرچہ انھوں نے چند سطروں بعد اپنے اسی دعویٰ کی تردید کردی۔ لکھتے ہیں: یہ پانچوں قصے اپنی اپنی جگہ بڑے قابل قدر ہیں۔ان میں پلاٹ کی وحدت اور سادگی سبھی کچھ موجود ہے[گیان چند، اردو کی نثری داستانیں، ۲۷۹] تاہم ان پانچوں قصوں سے جو تصور جمال کشید ہوتا ہے، اس میں نہ صرف وحدت پائی جاتی ہے بلکہ یکسوئی بھی دکھائی دیتی ہے۔

۳۔ عبیدہ بیگم، فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات (الہ آباد: فائن آفسٹ ورکس، ۱۹۸۳ء)، ۳۳۱۔

۴۔ میر امن، باغ و بہار، مرتبہ رشید حسن خان (نئی دلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۲ء)، ۳۴۔

۵۔ ایضاً، ۳۴۔

۶۔ ایضاً، ۳۷، ۳۸۔

۷۔ ایمانویل کانٹ [Immanuel Kant]*Critique of Judgment*، (لندن: میکملن اینڈ کمپنی لمیٹڈ، ۱۹۳۱ء)، ۵۶۔

۸۔ میر امن نے تحیر کی جو کیفیت بیان کی ہے اس سے یہی معنیٰ مترشح ہوتے ہیں۔ایک جگہ لکھتے ہیں: ''نظر کی مجال نہ تھی جو اس کے جمال پر ٹھہرے''۔میر امن، باغ و بہار، مرتبہ رشید حسن خان، ۲۹۔

۹۔ میر امن، باغ و بہار، مرتبہ رشید حسن خان، ۲۵، ۲۶۔

۱۰۔ ایضاً، ۲۸۔

۱۱۔ ایضاً، ۱۲۳۔

۱۲۔ ایضاً، ۷۶۔

۱۳۔ ایضاً، ۷۷، ۷۸۔

۱۴۔ ایضاً، ۷۹۔

۱۵۔ ایضاً، ۸۱۔

۱۶۔ ایضاً، ۱۹۶، ۱۹۷۔

۱۷۔ ایضاً، ۲۰۰۔

۱۸۔ ایضاً، ۲۲۹۔

۱۹۔ کہانی کے اس مقام پر سکرین پلے(screenplay) میں کمزوری ہے کیوں کہ کہانی میں یہ بتایا گیا ہے کہ عین شب زفاف محل کی چھت پھٹ جاتی ہے اور اس میں سے ایک مرصع تخت نیچے اترتا ہے اس پر ایک جوان خوب صورت شاہانہ لباس پہنے بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ بہت سے آدمی ہیں جو اس کے شوہر کو قتل کر دیتے ہیں اور وہ جوان لڑکی کے نزدیک آ کر کہتا ہے کیوں جانی اب ہم سے کہاں بھاگو گی؟ [میر امن، باغ و بہار، مرتبہ مولوی عبدالحق، ۲۵۸۔] مذکورہ عبارت کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جنات اس لڑکی پر پہلے سے عاشق تھا، اسی لیے غیرت میں آ کر اس نے اس کے نئے نویلے شوہر کو قتل کر دیا۔لیکن کہانی کے پلاٹ سے کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیوں کب اور کیسے اس کے عشق میں مبتلا ہوا؟۔ پھر ایک سوال یہ بھی پیدا

ہوتا ہے کہ جب اس نے اس دوشیزہ کے شوہر کو قتل کر دیا تھا تو وہ لڑکی کو لے کر رفو چکر کیوں نہ ہو گیا؟ اور اگر کسی وجہ سے ایسا نہیں بھی کیا تو لڑکی کی تلاش اس کے لیے کون سی مشکل تھی؟

۲۰۔ میر امن، باغ و بہار، مرتبہ رشید حسن خان، ۲۵، ۲۶۔

۲۱۔ ایضاً، ۱۰۳۔

۲۲۔ کانٹ کا تصور جلال اگرچہ اس کے مقولۂ کمیت (quantity) سے تعلق رکھتا ہے اور اپنی کمیت کے اعتبار سے وسعت و پہنائی میں لامتناہیت کا حامل ہوتا ہے اسی لامتناہیت کے سبب وہ غیر مجسم اور غیر متشکل ہوتا ہے جب کہ میر امن کا تصور جمال مقولۂ کیفیت (quality) سے تعلق رکھتا ہے اور اپنی کیفیت کی وسعت و پہنائی میں لامتناہیت کا حامل ہونے کی وجہ سے الفاظ میں اس کی تصویر کشی ممکن نہیں۔

۲۳۔ کانٹ کے تصور جلال کی تفصیل جاننے کے لیے دیکھیے کانٹ کی درج ذیل کتب:

i۔ امانوئیل کانٹ [Immanuel Kant]، *Critique of Judgment*، مترجم جے ایچ برناڈ [J. H. Bernard]، (نیو یارک: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۷ء)۔

ii۔ امانوئیل کانٹ [Immanuel Kant]، *Observation on the Feeling of the Beautiful and Sublime* (نیو یارک: کیمرج یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۱ء)۔

۲۴۔ میر امن، باغ و بہار، مرتبہ رشید حسن خان، ۳۷۔

۲۵۔ ایضاً، ۴۲۔

۲۶۔ ایضاً ۴۷۔

۲۷۔ ایضاً، ۲۶۔

۲۸۔ ایضاً، ۴۲۔

۲۹۔ سید وقار عظیم، ہماری داستانیں (لاہور: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۵۶ء)، ۱۱۰۔

۳۰۔ میر امن، باغ و بہار، مرتبہ رشید حسن خان، ۴۳۔

۳۱۔ ایضاً، ۲۹۔

۳۲۔ ایضاً، ۵۳۔

۳۳۔ ایضاً، ۵۳۔

۳۴۔ ایضاً، ۳۶-۳۷۔

۳۵۔ ایضاً، ۸۶۔

۳۶۔ ایضاً، ۲۶۔

۳۷۔ ایضاً، ۴۰۔

۳۸۔ ایضاً، ۶۶-۶۵۔

۳۹۔ ایضاً، ۴۹۔

۴۰۔ ایضاً، ۳۳۔

۴۱۔ رشید حسن خان نے ''پھولے'' کا حاشیہ یوں تحریر کیا ہے ''پھولے: ہندی مینول اور خطی نسخہ روایت اول میں '' پھولا ہی'' جب کہ مولوی عبدالحق کے نسخہ

میں ''پھولی ہے'' لکھا ہے''۔ (میر امن، باغ و بہار، مرتبہ رشید حسن خان، ۳۰۰)]، ایضاً، ۵۵۔

۴۲۔ ایضاً، ۴۱۔

ماخذ

امانوئیل کانٹ [Immanuel Kant]۔ *Critique of Judgment*۔ مترجم جے ایچ برناڈ [J. H. Bernard] نیو یارک: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۷ء۔

_______۔ *Critique of Judgment*۔ لندن: میکملن اینڈ کمپنی لمیٹڈ، ۱۹۳۱ء۔

_______۔ *Observation on the Feeling of the Beautiful and Sublime*۔ نیو یارک: کیمرج یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۱ء۔

دہلوی، میر امن۔ باغ و بہار۔ مرتبہ رشید حسن خان۔ نئی دلی: انجمن ترقیٔ اردو ہند، ۱۹۹۲ء۔

عبیدہ بیگم۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات۔ الہ آباد: فائن آفسٹ ورکس، ۱۹۸۳ء۔

گیان چند۔ اردو کی نثری داستانیں۔ لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۷ء۔

وقار عظیم، سید۔ ہماری داستانیں۔ لاہور: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۵۶ء۔